خواجہ عبدالحمید یزدانی

مثنوی رومی میں ذکر خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

(۲)

عہدِ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک شخص کی داستان بیان کرکے — جو حضور حق بڑے عجز و انکسار کے ساتھ بغیر محنت و مشقت کے حلال روزی کی دعا کرتا تھا — سرورِ کائنات کی اس حدیثِ مبارکہ کو زینتِ عنوان بنایا ہے "ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء" (اللہ تعالیٰ دعا میں عجز و الحاح کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) " اور اس کی کسی قدر تشریح، عنوان ہی میں اس طرح کردی گئی ہے " زیرا کہ دعا کنندہ عین خواستست از حق تعالیٰ و الحاح خواہندہ را بہست از آنچہ می خواہد آن را از وی "[۱]

اگرچہ اس داستان میں، جو وقفوں کے ساتھ بیان ہونے کے باعث دور جاکر ختم ہوئی ہے، اس طرف بظاہر کوئی اشارہ نہیں ملتا، تاہم پوری داستان کو اس حدیثِ مبارکہ کی کامل تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ اس داستان کے دوسرے حصے کے آخر میں، جس کا عنوان حدیثِ مذکور ہے، سُنّی اور جبری کے حوالے سے مسلمانوں میں فرقہ پرستی کو موردِ ذم ٹھہرایا گیا ہے۔ داستان کا ملخص یہ ہے کہ حضرت داؤد کے زمانے میں کوئی شخص اللہ کے حضور بڑے عجز و انکسار کے ساتھ مسلسل یہ دعا کرتا ہے کہ مجھے بغیر محنت کے روزی حلال عطا فرما۔ اتفاق سے ایک روز ایک گائے اس کے گھر میں آگھستی ہے، جسے وہ فوراً ذبح کرکے قصاب کے پاس کھال اتروانے کے لیے لے جاتا ہے۔ اسی اثنا میں گائے کا مالک اُسے آپکڑتا اور گائے ذبح کرنے کا سبب پوچھتا ہے۔ وہ اسے اپنی مسلسل دعا کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ لیکن مالک اس کی اس دلیل کو غلط بتاتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مدعا علیہ پھر اللہ کے حضور رسوائی سے بچنے کے لیے عاجزانہ دعا کرتا ہے۔ اُسے حضرت داؤد کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی سات

---

[۱] کیونکہ دعا کنندہ جو کوئی بھی گراں بہا چیز اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اس (چیز) کی نسبت اس کا اللہ کے حضور الحاح خود اس کے لیے کہیں بہتر ہے۔

سالہ مسلسل دعا کا حوالہ دیتا ہے، جسے رد کیا جاتا اور اُسے گائے کی قیمت چکانے کو کہا جاتا ہے۔ مدعا علیہ پھر اسی انداز میں دعا کرتا ہے۔ اسے ایک روز کی مہلت دی جاتی ہے۔ اسی دوران میں حضرت داؤد کو اللہ جل شانہ کی طرف سے مزاد انتقام کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ دوسرے روز حضرت داؤد مدعی سے کہتے ہیں کہ وہ مدعا علیہ کو معاف کر دے، وہ اس فیصلے کو ظلم قرار دیتا ہے، جس پر حضرت داؤد اسے اپنا سارا مال و متاع دعا کنندہ کو دے دینے کو کہتے ہیں۔ یہ فیصلہ مدعی اور حاضرین کی تنقید کا سبب بنتا ہے۔ آخر حضرت داؤد راز سے پردہ اٹھاتے اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ مدعی، مدعا علیہ کے باپ کا غلام تھا۔ مدعا علیہ ابھی بچہ تھا، جب مدعی نے اس کے باپ کو قتل کر دیا، اس کی لاش فلاں درخت کے نیچے چھپا دی اور سارا مال ہتھیا لیا۔ اللہ نے اپنے حلم کے سبب اس کا یہ گناہ چھپا رکھا تھا، لیکن اب اس نے اپنی ناشکری کے باعث ـــ کہ اس نے آقا کے بچوں کی خبر گیری نہ کی، بے نواؤں کو کبھی کھانا نہ کھلایا اور اب اپنے آقا کے لڑکے کو ایک گائے کی خاطر بُری طرح مارا پیٹا ـــ خود ہی اس گناہ سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ بعد میں مذکورہ درخت کے نیچے مدفون وہ لاش نکالی جاتی ہے اور قاتل یعنی مدعی اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے۔

داستان کے دوسرے حصے سے جو مذکورہ حدیث کے عنوان سے مزین ہے، چند اشعار فرقہ پرستی کی مذمت میں ملاحظہ ہوں:

آدمی مُنکر ز تسبیح جماد — وآن جماد اندر عبادت اوستاد
بلکہ ہفتاد و دو ملت ہر یکی — بی خبر از یکدگر اندر شکی
چون دو ناطق راز حال ہمدگر — نیست آگہ، چون بود دیوار و در
چون من از تسبیح ناطق غافلم — چون بداند صبحہ صامت دلم
ہست سُنی را یکی تسبیح خاص — ہست جبری را ضد آن در مناص
سُنی از تسبیح جبری بے خبر — جبری از تسبیح سُنی بی اثر
این ہمی گوید کہ آن ضالست و گم — بے خبر از حال او وز امر قم
وآن ہمی گوید کہ این را چہ خبر — جنگشان افگند یزدان از قدر
گوہر ہر یک ہویدا می کند — جنس از ناجنس پیدا میکند

قہر را از لطف داند ہر کسی خواہ نادان خواہ دانا یا خسی[۵۲]

معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ اصلِ فطرت میں عقولِ انسانی برابر و یکساں ہیں، اور اگر ان میں کوئی فرق آتا ہے تو وہ تحصیلِ علم کے سبب ہے۔ مولانا اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانوں کی عقلوں میں فطری طور پر ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ حسینوں کی صورتوں میں۔ اس ضمن میں انھوں نے حضور اکرمؐ کی اس حدیث "جمال الرجل فصاحۃ لسانہ" (انسان کا حسن اس کی فصاحتِ زبان میں پوشیدہ ہے) کا ذکر کیا اور مزید وضاحت کے لیے ایک استاد اور اس کے شاگردوں کی تمثیل پیش کی ہے کہ کس طرح جابز استاد سے نجات پانے کے لیے ایک زیرک بچے کی تجویز پر چند بچوں نے باری باری استاد سے کہا کہ آپ کا رنگ زرد کیوں ہے، اور اس طرح اُسے وہم میں ڈال دیا کہ وہ بیمار ہو گیا ہے، اُسے آرام کرنا چاہیے۔ مولانا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر عقولِ انسانی مساوی ہوتیں اور حصولِ تعلیم سے ان میں کوئی فرق پڑتا تو وہ بچہ جس کا کوئی تجربہ نہ تھا اور جو علم سے بھی بہرہ ور نہ تھا، کبھی ایسی چال نہ سوچ سکتا جو مردانِ کار کی عقل سے بھی بڑھ کر تھی، اور جس سے ایک "پیرِ باصد تجربہ" بھی بالکل بے خبر اور عاجز رہا۔ لہٰذا جہد و فکر کے نتیجے میں حاصل شدہ عقل کی نسبت فطرت کی طرف سے ودیعت کردہ عقل بہتر اور افزوں ہے۔ اوّل الذکر عقل کو مولانا لنگڑی بتاتے ہیں، جس کے لیے راستہ چلنا دشوار ہوتا ہے۔

رای آن کودک بچر بید از ہمہ عقل او در پیش میرفت از رمہ
آن تفاوت ہست در عقل بشر کہ میان شاہدان اندر صور
زین قبل فرمود احمدؐ در قال در زبان پنہان بود حسن رجال
اختلاف عقلہا در اصل بود بہر وفاقِ سُنّیان باید شنود
بر خلاف قول اہلِ اعتزال کہ عقول از اصل دارند اعتدال
تجربہ و تعلیم بیش و کم کند تا یکی را از یکی اعلم کند
باطلست این زانکہ رای کودکی کہ ندارد تجربہ در مسلکی
بگذرد زاندیشۂ مردانِ کار عاجز آید کارشان در اضطرار

---

۵۲ کتاب مثنوی، ص ۲۳۹

بر دمید اندیشہ زآن طفلِ خُرد — پیرِ با صد تجربہ بوئی نبُرد
خود فزون آن بہ کہ آن از فطرتست — تا زِ افزونی کہ جہد و فکرت ست
تو بگو دادۂ خدا بہتر بود — یا کہ لنگی راہوانہ رود[۴۳]

استاد اور شاگردوں کی اسی داستان کے تیسرے حصے میں مولانا نے سید البشر کی اس حدیث سے استفادہ کیا ہے کہ اگر مرض کو خود پر طاری کر لوگے تو واقعی بیمار پڑ جاؤ گے[۴۴]

جب لڑکوں نے استاد کو اس وہم میں ڈال دیا کہ اس کا رنگ زرد ہے اور وہ بیمار ہے تو وہ ہائے مر گیا وائے مر گیا کرتا گھر پہنچا۔ بیوی نے خلافِ معمول جلد آنے کا سبب پوچھا۔ وہ جھنجھلا کر بولا، اندھی ہو؟ لوگوں کو میری بیماری نظر آرہی ہے اور تمھیں پتا ہی نہیں چل رہا۔ بیوی نے اُسے وہم قرار دیا، اُستاد کو غصہ آگیا اور اول فول بکتے ہوئے کہنے لگا: اے دشمنِ جاں فوراً میرا بستر بچھادے۔ بیوی بڑی پریشان ہوئی، دل میں کہنے لگی اگر صحیح بات کہتی ہوں تو یہ مجھے تہمت تراش سمجھے گا اور اگر خاموش رہتی ہوں تو یہ معاملہ خطرناک صورت اختیار کر لے گا، اس لیے کہ جس انسان کو کوئی بھی مرض و غم نہ ہو، محض فالِ بد کی بنا پر وہ بھی خود کو مریض سمجھنے لگتا ہے۔ یہاں مولانا فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث لائے ہیں۔ اس کے بعد اس عورت کی ذہنی کشمکش کا بیان ہے کہ اگر میں اُسے یہ حدیث بتاتی ہوں تو خدا جانے وہ میرے بارے میں کیا خیال کرے، مجھے بُرا بھلا کہے اور میرے اس عمل کو میرے سوءِ قصد یعنی خواہشِ تخلیہ پر محمول کرکے مجھے گھر سے نکال باہر کرے۔ آخر اسی گو مگو کی حالت میں اس عورت نے بستر بچھا دیا اور حضرتِ استاد اس پر دھڑام سے گر کر زور زور سے ہائے وائے کرنے لگے:

زن توقف کرد مردش بانگ زد — "کای عدو زوتر، ترا این می سزد؟"
جامہ خواب آورد و گسترد آن عجوز — گفت امکان نی و باطن پُر ز سوز
گر بگویم متہم دارد مرا — ور نگویم جد شود این ماجرا
فالِ بد، رنجور گرداند ہمی — آدمی را کہ نبودستش غمی
قولِ پیغمبرؐ قبولہ یفرض — اِن تمارضتم لدینا تمرضوا

---

[۴۳] کتاب مثنوی، ص ۲۴۰

[۴۴] اِن تمارضتم لدینا تمرضوا

گر بگویم او خیالی برزند　　فعل دارد زن کہ خلوت می کند
مر مرا از خانہ بیرون میکند　　بہر فسقی فعل و افسون میکند
جامہ خواب افکند و استاد او فتاد　　آہ آہ و نالہ از وی می بزاد[۵۵]

ایک امیرزادے کی داستان میں، جو کسی نابکار کے عشق میں مبتلا ہو کر کنگال ہو چکا ہے اور گدڑی پہن کر بازاروں میں گھومتا پھرتا اور خاص و عام سے دعا کرنے کو کہتا ہے تاکہ اس بدبختی سے اُسے نجات حاصل ہو، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سعادت اثر احمدؐ کے لقب سے آیا ہے۔ اس حصے میں مولانا نے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ قضا کا پھندا ظاہری طور پر نظر نہیں آتا، البتہ اثر کے لحاظ سے وہ آشکار و ظاہر ہوتا ہے، اور اس پوشیدہ بندِ تقدیر و قضا کو جو زندان اور بندِ آہن سے بھی بدتر ہے، صرف اللہ والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا بندِ آہن وغیرہ سے سخت تر و بدتر ہونا اس لحاظ سے ہے کہ نقب زن زندان کی دیوار میں سوراخ کر کے نکل سکتا ہے اور بیڑیوں کو لوہار کاٹ سکتا ہے، لیکن اُسے (بندِ قضا کو) توڑنے میں بڑے بڑے لوہار بھی عاجز ہیں۔ مولانا نے یہاں اس قول کی کہ اس بندِ قضا و تقدیر کو حضورِ اکرمؐ ہی کی ذات والا صفات دیکھ سکتی ہے، قرآنی حوالے سے تصدیق کی ہے۔

سورہ اللہب میں ابی لہب کے علاوہ اس کی بیوی کا بھی ذکر آیا ہے جو عناد و دشمنی کے باعث حضورؐ کے راستے میں خار دار لکڑیاں بچھایا کرتی تھی، اور اسی بنا پر اُسے حمالۃ الحطب[۵۶] کہا گیا ہے اور یہ کہ (دوزخ میں پہنچ کر) اس کے گلے میں خوب بٹی ہوئی ایک رسی ہوگی۔ اس عورت کا انجام عبرت ناک ہوا، یعنی ایک روایت کے مطابق لکڑیوں کے گٹھے کی رسی سے گلا گھٹ جانے سے اس کی موت واقع ہوئی[۵۷] مولانا فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی لہب کی بیوی کی گردن میں کھجور کی کھال سے بٹی ہوئی

---

۵۵ کتاب مثنوی، ص ۲۴۱

۵۶ بعض کے نزدیک حمالۃ الحطب کے معنی چغل خور کے بھی ہیں۔ وہ عورت چغل خور بھی تھی۔ (اللہب۔ حاشیہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

۵۷ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد اوّل، ص ۹۰۳

رسّی دیکھ لی تھی اور اس کی پشت پر لکڑیوں کا گٹھا دیکھ کر اسے حمالۃ الحطب کہا تھا۔ یہ رسّی اور ہیزم صرف حضورؐ ہی کی ذاتِ اقدس دیکھ سکتی تھی۔ یہ معاملہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے، وہ تو صرف تاویلوں سے کام لیتے ہیں، حالانکہ بندِ قضا میں جکڑا ہوا انسان عالمِ ناتوانی و پریشانی میں، اس بند سے رہائی کے لیے ایک ایک سے دعا کرنے کو کہتا پھرتا ہے۔ اس کے بعد مولانا کہتے ہیں کہ وہ ذاتِ ستودہ صفاتؐ جو ان علامات کو واشگاف اور کھلے طور پر جانتی ہے، بھلا یہ کیونکر نہ جان سکے گی کہ بدبخت کون ہے اور خوش بخت کون؟ وہ ذاتِ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ جانتی ہے۔

اس حصے کے شروع میں مولانا نے امیرزادے کی دعا طلبی کا ذکر کرتے ہوئے بندِ قضا کی پنہانی کی بڑے پیارے اور اچھوتے انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ فرماتے ہیں ہاتھ بھی کھلے ہیں، پاؤں بھی کھلے ہیں جن میں کوئی بیڑی نہیں، نہ کوئی سر پر نگران و محافظ ہے اور نہ کوئی لوہے کی زنجیر، پھر میاں تو کس پھندے سے نجات کا طالب اور کس قید سے رہائی کا خواہاں ہے:

این دعا میخواہد او از خاص و عام | کالخلاص و الخلاص و الخلاص
دست بازو پای باز بند نی | نی مؤکّل بر سرش فی آہنی
از کدامین بند می جوئی خلاص | وز کدامین قید میخواہی مناص
بند تقدیر و قضای مختفی | ہان نبیند آن بجز جان صفی
گرچہ پیدا نیست آن در مکمن است | بدتر از زندان و بند آہن است
زانکہ آہنگر مر آن را بشکند | حفرہ گر ہم خشت زندان بر کند
این عجب این بند پنہان گران | عاجز از تکسیر آن آہنگران
دیدن آن بند احمدؐ را رسد | بر گلوئی بستہ حبل من مسد
دید بر پشت عیال بولہب | تنگ ہیزم گفت حمّال الحطب
حبل و ہیزم را جز او چشمی ندید | کہ پدید آید بر او ہر ناپدید
باقیانش جملہ تاویلی کنند | کاین ز بیہوشیست و ایشان ہوشمند
لیک از تاثیر آن پشتش دوتو | گشتہ و نالان شدہ او پیش تو
کہ دعای ہمتی تا وا رہم | تا ازین بند نہان بیرون جہم

آنکہ داند این علامتہا پدید　　چون نداند اُو شقی را از سعید

داند و پوشید ز امر ذو الجلال　　کہ نداند کشفِ راز حق، حلال[۵۵]

"سبب جرأت ساحران فرعون بقطع دست و پای خود" کے عنوان کے تحت ایک جگہ خواب اور حقیقت پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں دنیوی زندگی کو سونے والے کے خواب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مولانا پہلے حضرت موسیٰ اور ساحرانِ فرعون سے متعلق وہ قرآنی قصہ مختصراً پیش کرتے ہیں جس کے متعلق دربارِ فرعون میں حضرت موسیٰ کے معجزے سے متاثر ہو کر ساحر، خدائے واحد کے حضور سربسجود ہو گئے اور فرعون کی جان سے مار دینے کی دھمکی سے ڈرے بغیر انھوں نے خود کو ابِ صحیح راہ پر جا تا[۵۶]۔ مولانا فرماتے ہیں کہ فرعون کو اس کی خبر نہ تھی کہ انھوں نے اپنی حقیقت کو جان لیا ہے، اور اصلِ حقیقت (صحیح زندگی بعد از موت) سے آگاہ ہونے کے بعد وہ وہم و ظن (جسمانی موت) سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد مولانا "ظن" اور "خواب" کی طرف رجوع کر کے دنیوی زندگی کو خواب قرار دیتے اور ظن سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے مختلف امثال سے اس نکتے کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص خواب میں اپنا سر کٹتا دیکھے تو اس سے کیا فرق پڑے گا کہ سر تو اسی طرح اپنی جگہ قائم رہے گا، البتہ تعبیر کے لحاظ سے یہ درازیٔ عمر کی علامت ہے۔ یا اگر کوئی شخص خواب میں خود کو دو ٹکڑے ہوتا دیکھے تو بیدار ہونے پر وہ ویسا ہی صحیح و سالم ہوگا جیسا وہ سویا تھا۔ گویا خواب میں جسم کے سیکڑوں ٹکڑے ہو جانے پر بھی جسم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ چنانچہ بظاہر زندہ و بیدار نظر آنے والی اس دنیا کو حضورِ اکرم نے سونے والے کے خواب سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا عام لوگوں کی اس حقیقت سے بے خبری اور سالکانِ راہِ حق کی باخبری کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ تم لوگ دن کے وقت بھی نیند ہی کے عالم میں ہو، لیکن اس حقیقت کو صرف دن کی روشنی کی بنا پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو، حالانکہ یہ روشنی تو محض عکس یعنی جزو ہے، مہتاب یعنی حقیقتِ ابدی کا۔ اس لحاظ سے تمھارا خواب بیداری اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ فلاں فلاں کام کر کے

---

۵۵ کتاب مثنوی، ص ۴۴۲ — مثنوی، ص ۳ / ۴۳

۵۶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ الاعراف، آیات ۱۰۴ - ۱۲۶

سوگیا ہے [۱۰] گویا بقول غالب :

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

این جہان خواب ست، اندر ظن مایست   گر رود در خواب دستی باک نیست
گر بخواب اندر سرت ببرید گاز   ہم سرت بر جاست ہم عمرت دراز
گر ببینی خواب در، خود را دو نیم   تندرستی، چون بخیزی، نی سقیم
حاصل اندر خواب نقصانِ بدن   نیست باکی از دو صد پارہ شدن
این جہان را کہ بصورت قائم ست   گفت پیغمبرؐ کہ "حلم نائم" است
از رہِ تقلید تو کردی قبول   سالکان این دیدہ پیدا بی رسول
روز در خوابی، مگو کاین خواب نیست   سایہ فرع ست، اصل جز مہتاب نیست
خواب بیداریست آن دان ای عضد   کہ ببیند خفتہ کو در خواب شد
او گمان بردہ کہ ایندم خفتہ ام   بیخبر زآن کوست در خواب دوم [۱۱]

ایک ولی اللہ کی داستان میں، جس نے اپنے بیٹوں کی وفات پر آہ و زاری نہ کی، سرور کائنات صلی اللہ

---

[۱۰] مزید وضاحت کے لیے تشبیہاتِ رومی سے چند سطور ملاحظہ ہوں، "خواب اور حقیقت کا فرق باہمی مقابلے سے ہی ہوتا ہے، جب تک انسان خواب دیکھ رہا ہے اس کے حقیقی ہونے میں اس کو کوئی شک نہیں ہوتا لیکن بیدار ہونے کے بعد جب ایک منظم اور مقابلتاً استوار و پائدار عالم سے عالم خواب کا مقابلہ کرتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ خواب کا عالم وہمی و تخیلی تھا۔ حیات و کائنات میں ہستی و حقیقت کے کئی مدارج ہیں۔ ادنیٰ درجے کی حقیقت اعلیٰ کے مقابلے میں کم حقیقی دکھائی دیتی ہے۔ بعض اوقات ہمارا عالمِ خواب بھی کیڑوں مکوڑوں کی بیداری سے زیادہ حقیقی ہوتا ہے۔ ارتقائے حیات میں ہر درجہ اسفل جسے انسان پیچھے چھوڑ چکا ہے مقابلتاً غیر اصلی اور وہمی معلوم ہوگا۔ رسولِ کریمؐ نے جو اس دنیوی زندگی کو حلم النائم یعنی سونے والے کا خواب کہا تو اس کے یہی معنی ہیں۔ مرنے کے بعد جب اس پر حقائق کا زیادہ انکشاف ہوگا تو وہ اپنی گزشتہ دنیاوی زندگی کو ایک خواب کی طرح بے حقیقت سمجھے گا اور کہے گا کہ کتنی چیزوں کو میں اصل اور قائم و دائم سمجھتا تھا جنھیں اب میری موجودہ بصیرت نے بے اصل ثابت کر دیا۔" (ص ۳۵۶، ۳۵۷)

[۱۱] کتاب مثنوی، ص ۳۴۵، ۳۴۶

علیہ وسلم کی دو احادیثِ مبارکہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ ایک خدارسیدہ بزرگ کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے کسی قوم میں نبی کی ہو۔ دوم یہ کہ حضورؐ نے فرمایا میں شفیع عاصیاں ہوں، روز قیامت گنہگاروں کو مایوس و آزردہ نہ ہونے دوں گا۔ اس حصے میں ایک جگہ لفظ "تشفیع" آگیا ہے جس سے استفادہ کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں کہ فخرِ موجوداتؐ نے فرمایا ہے میں قیامت کے روز گناہ گاروں کو اشک ریز نہ ہونے دوں گا۔ میں دل و جان سے عاصیوں کی شفاعت کرنے والا ہوں تاکہ انھیں شدید عذاب سے نجات دلاؤں۔ عام گناہ گاروں اور گناہ ہائے کبیرہ کے مرتکبین کو اس عذاب سے رہائی دلاؤں گا جو نقض عہد کے سبب ان پر نازل ہوگا۔ جہاں تک میری امت کے صالحین کا تعلق ہے وہ نہ صرف میری شفاعت سے فارغ رہیں ہیں بلکہ خود اُن کو شفاعت کرنے کا حق ہوگا کیونکہ ان کی بات کو "حکم نافذ" کی حیثیت حاصل ہوگی:

بود شیخی رہنمائی پیش از این	آسمانی شمع بر روی زمین
چون پیمبر در میان اُمتان	در گشای روضۂ دارالجنان
گفت پیغمبرؐ کہ شیخ رفتہ پیش	چون نبی باشد میان قوم خویش
گفت پیغمبرؐ کہ روز رستخیز	کی گذارم مجرمان را اشک ریز
من شفیع عاصیان باشم بجان	تا رہانمشان ز اشکنجہ گران
عاصیان و اہل کبائر را بجہد	وا رہانم از عتاب نقض عہد
صالحانِ اُمتم خود فارغند	از شفاعتہای من روز گزند
بلکہ ایشان را شفاعتہا بود	گفتشان چون حکم نافذ میرود[۱۵]

"در قصہ دقوقی و کراماتش" میں ایک جگہ جُزو و کُل کی بحث کے دوران حضورؐ سرور کائنات کا یہ قول مبارک پیش کیا گیا ہے کہ میں تمھارے لیے باپ کی طرح شفیق و مہربان ہوں، اس لیے کہ تم سب میرے اجزا ہو، لہٰذا جزو کو کُل سے کیوں الگ کرتے ہو۔ اس کے بعد مولانا نے جزو و کُل کے باہمی ربط وغیرہ سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں، جب کوئی جُزو اپنے کُل سے کٹ جائے تو وہ بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس کی مثال جسم کے کسی حصے سے دی جا سکتی ہے کہ اگر اسے جسم سے کاٹ دیا جائے تو اس کی صورت بے جان

---

۱۵ کتاب مثنوی، ص ۲۴۲

اور مُردار شے کی سی ہو جاتی ہے۔ تو گویا جب تک جزو کو اس کے کُل سے دوبارہ نہ ملایا جائے وہ حرکت اور جان سے دُور ہی رہے گا۔ پھر مولانا فرماتے ہیں کہ اگر ایسے حصّے یا جُزو میں زندگی کے کچھ آثار پائے بھی جاتے ہوں تو اس کی یہ زندگی اور جان قابلِ تسلیم و استناد نہ ہوگی، کیونکہ تازہ کٹے ہوئے عضو میں بھی تھوڑی بہت اور وہ بھی وقتی حرکت و زندگی موجود ہوتی ہے۔ اس دنیوی جزو و کُل سے، جسے اوّل و آخر فنا ہے، بحث کرتے ہوئے مولانا حقیقتِ ابدی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق جزو و کُل کے اس باہمی ربط کا، جو ہمیں عالمِ مادی میں نظر آتا ہے، اطلاق عالمِ روحانی پر نہیں ہوتا۔ "ارواح کو ذاتِ الٰہی کے اجزا محض تشبیہاً کہہ سکتے ہیں۔ انسان ایک عضوی وجود ہے، لیکن حیات و کائنات کے اجزا خدا کے جسم کے اجزا نہیں، کیونکہ خدا کا کوئی جسم نہیں۔ انسان کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اس کُل سے وابستہ ہو جا جس کو خدا کہتے ہیں۔ لیکن ہم اگر مردار اور بے کار ہو کر خدا سے کٹ جائیں تو کیا خدا کی ذات میں کچھ خلل آتا ہے، ہرگز نہیں۔ لہٰذا روحِ انسانی اور خدا کا معاملہ مادی جزو و کُل کا سا نہیں، یہ ایک ناقص سی تشبیہ ہے"[۱۳۱]

آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں کہ خدا کے متعلق مثالیں ہی بیان کی جا سکتی ہیں، مگر مثل اور مثال میں فرق ہے۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں کہ یہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شیرِ خدا کہا جاتا ہے تو اس سے وہ مذکورہ درندہ تو نہیں بن جاتے:

گفت پیغمبر شما را ای مہان ۔۔۔ چون پدر ہستم شفیق و مہربان
زآن سبب کہ جملہ اجزای منید ۔۔۔ جزو را از کل چرا بر می کنید
جزو از کل قطع شد بیکار شد ۔۔۔ عضو از تن قطع شد مردار شد
تا نپیوندد بکلّ بارِ دگر ۔۔۔ مُردہ باشد نبودش از جان خبر
ور بجنبد نیست خود او را سند ۔۔۔ عضوِ نو بُبریدہ ہم جنبش کند
جزو ازین کلّ گر برد یکسو رود ۔۔۔ این نہ آن کُلّ است کو ناقص شود
قطع و وصل او نیاید در مقال ۔۔۔ چیز ناقص گفتہ شد بہر مثال

---

۱۳۱ تشبیہاتِ رومی، ص ۳۶۰

مرعلی را بر مثالِ شیر خوانند　　　شیرِ مثلِ او نباشد گرچہ رانند[۱۵]

اسی "دقوقی" کے قصے میں ایک جگہ حضور سید البشر کی ایک حدیث مبارک کا ترجمہ پیش کیا گیا اور حضورؐ کو مصطفیٰ، قطب، شہنشاہ اور دریائے صفا کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔

اس حصے میں مولانا نے ایک کشتی کے غرق ہوتے وقت اہلِ کشتی کی داد و فریاد اور عبادت کی رقت انگیز تصویر کشی کی ہے، کہ کس طرح زاہد و فاسق اور کافر و ملحد سب دینی و دنیوی جھگڑے بھول کر اس خالق واحد کے حضور پورے عجز و خلوص کے ساتھ سربسجود اور گڑگڑا کر نجات کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایسے مواقع پر جب انسان کی تمام کوشش و چارہ جوئی بے کار اور رائیگاں جاتی ہے تو اُسے خدا یاد آتا ہے اور وہ مائل بہ دعا ہوتا ہے۔ لیکن جب اُسے اس مصیبت سے نجات مل جاتی ہے تو وہ اللہ کے حضور اپنی وہ ساری گریہ زاری اور خلوصِ نیت اور اس کے جواب میں اللہ کا احسان و کرم بھول جاتا اور حسبِ سابق حرص و آز کے دانت تیز کرنے لگتا ہے۔ مولانا کے مطابق انسان کو اس کی اس حرکت پر ہر ہر وقت آگاہ کیا جاتا ہے، لیکن اس ندائے غیبی کو صرف دنیوی حرص اور جھنجھٹوں سے آزاد بندۂ خاصِ خدا ہی سن سکتا ہے۔ اس کے بعد مولانا، فخرِ کائنات کو قطب، شاہنشاہ اور دریائے صفا کے القاب سے یاد کرتے ہوئے حضورؐ کے اس قولِ مبارک کی تصدیق کرتے ہیں کہ جو کچھ جاہل آخر میں دیکھتا ہے عاقل اُسے آغاز ہی سے دیکھ لیتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ حوادث اور امورِ تسدنی غیب کی طرف سے ازل ہی میں موجود ہوتے ہیں جنھیں عاقل شروع ہی میں دیکھ لیتا ہے۔ لیکن نافرمان اور اپنے کفر پر اڑنے والا آخر میں دیکھتا ہے۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہو گی کہ حوادث و تقدیرات غیب کی طرف سے ازل ہی سے متعین کر دی گئی ہیں، جیسا کہ سورۃ الحدید میں ایک جگہ آیا ہے: کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمھاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوحِ محفوظ میں) لکھی ہے، قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں... تو انھیں وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی دیکھ لینا انسان کی معراج ہے۔ ورنہ اُن کے ظاہر یا وقوع پذیر ہونے پر تو ہر کس و ناکس دیکھ لیتا ہے۔ سو اگر کوئی انھیں صورتِ اول ہی میں نہ دیکھ پائے تو یہ اس کے لیے سراسر زیان و نقصان کا سبب بنتا ہے جبکہ پیش بینی و دور اندیشی سیلابِ حوادث کے لیے سدِ راہ بن سکتی ہے۔

---

۱۵ کتاب مثنوی، ص ۲۵۱ — مثنوی، ۳/۵۰

اس کے بعد مولانا نے حزم پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے بدگمانی اور ہر لحظہ بلائے ناگہانی دیکھنے سے تعبیر کیا ہے :

در دعا ایشان و در زاری و آہ	بر فلک زایشان شدہ دود سیاہ
دیو اندم از عداوت تیز بین	بانگ زد کای سگ پرستان لعین
مرگ و جنگ ای اہل انکار و نفاق	عاقبت خواہد بُدن این اتفاق
چشمتان تر باشد از بعد خلاص	کہ شوید از بہر شہوت دیو خاص
یادتان ناید کہ روزی در خطر	دستتان بگرفت یزدان از قدر
این ہمی آمد ندا از دیو لیک	این سخن را نشنود جز گوش نیک
راست فرمودہ است با ما مصطفیٰ	قطب و شاہنشاہ و دریای صفا
کانچہ جاہل دید خواہد عاقبت	عاقلان بینند ز اول مرتبت
کار ہا ز آغاز غیب است و ستر	عاقل اول دید و آخر آن مُصر
اولش پوشیدہ باشد و آخر آن	عاقل و جاہل ببیند در عیان
گر نبینی واقعۂ غیب ای عنود	حزم را سیلاب کی اندر ربود

ایک جگہ دکان داری اور کاروبار میں نفع و نقصان کی تمثیل پیش کر کے مولانا نے مقلدین کے ایمان کو خوف و رجا کا مجموعہ بتایا ہے اور اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "اِنَّ اللہ تعالیٰ اولیآء اخفیاء" کے معنی بیان کیے ہیں۔

مولانا کے مطابق دین کے معاملے میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک قسم محققین کی ہے جو تھوڑی تعداد میں ہیں۔ یہ لوگ اپنی تحقیقات اور تجربات و مشاہدات کی بنا پر دینی زندگی کی راہوں پر بے کھٹکا گامزن رہتے ہیں۔ اس راہ میں انھیں نفع ہی نفع محسوس ہوتا ہے، اور وہ خوف و تذبذب سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ مقلدین ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی دین میں اس لیے شامل ہیں کہ اس دین والی جماعت میں پیدا ہوئے اور اس کے بعد دین کی باتیں سُن سنا کر کچھ عمل کرنے لگے۔ مولانا مؤخر الذکر کو مخاطب کر کے انھیں یقین کامل کے ساتھ راہ دین پر چلنے کی تلقین کرتے اور اس تجارت کو دنیاوی تجارت کی نسبت، جس میں نفع بھی ہے اور نقصان کا احتمال بھی، سراسر سود مند بتلاتے ہیں، اور یہ کہ

اس معاملے میں سُستی کی بجائے کچھ نہ کچھ کرنا بہتر ہے کہ سُستی میں زیادہ خوفِ نقصان ہے۔

پھر مولانا محققین و عارفین (اولیا و انبیا) کے عملِ پیہم اور یقینِ محکم کے نتائج بیان کرتے ہیں کہ کس طرح لوہا ان کے آگے موم، ہوا ان کی محکوم اور عنکبوت ان کی پردہ دار ہوتی ہے۔ مذکورہ حدیث کی تشریح میں ایسے ہی برگزیدگانِ الٰہی کے متعلق مولانا کہتے ہیں کہ یہ ہستیاں عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں اور دنیا پرستوں کے سامنے کم ہی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان بندگانِ خاص کے پردۂ اخفا میں رہنے کا یہ عالم ہے کہ اتنا کچھ رکھتے ہوئے بھی ایک لمحہ کے لیے عام نگاہ ان کی عفت و بزرگی پر نہیں پڑتی۔ ان کی کرامت ان کا وجود سب گویا چار دیواری میں پنہاں رہتا ہے۔ مولانا یہاں کرامت کی رعایت سے کہتے ہیں کہ اس کائنات کا چپہ چپہ اللہ جلّ جلالہ کے اکرامات و نوازشات کا مظہر ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس طرف بلاتا اور اپنی ان نوازشات سے آگاہ کرتا ہے، لیکن تم شاید اس کا شعور و بصیرت نہیں رکھتے۔

اس کے بعد مولانا کسی بندۂ خاصِ خدا کا دامن تھام لینے کی تحریض کرتے ہیں۔ ان کے بقول اگر ایسی ہستی آگ میں بھی کود جانے کو کہے تو کسی قسم کے خوف کے بغیر فوراً اس پر عمل پیرا ہو جاؤ، کیونکہ اس کے حکم سے آگ، نرگس و نسرین میں بدل جاتی ہے، اور اس میں شعلوں کی بجائے غنچے پھوٹنے لگتے ہیں۔ حقیقت میں جس طرح ظاہر پرست آگ سے خوف زدہ رہتے ہیں، اسی طرح خود آتش ایسی ہستی کے آگے خوف اور ہیبت سے لرزاں رہتی ہے۔ گویا آگ انبیا کے دسترخوان کو پاک کرنے والی شے ہے۔ اس ضمن میں (یعنی دسترخوان کے حوالے سے) مولانا نے حضرت انس بن مالک کے حکم سے دسترخوان کو تنور میں ڈالنے اور اس کے آگ سے محفوظ رہنے کی داستان بیان کی ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے حکم کے تحت ہوتی ہے اور وہ انھیں یا ان کے پیروکاروں کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکتی۔ اس حصے میں بھی حضور اکرم کا ذکر آیا ہے۔

ایک موقع پر حضرت انس نے چند مہمانوں کی دعوت کی۔ دعوت سے فارغ ہونے پر جب انھوں نے دسترخوان کو گندہ پایا تو خادمہ سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے اُسے تنور میں ڈال دو۔ خادمہ نے حکم کی تعمیل کی۔ تھوڑی دیر بعد جب اسے نکالا گیا تو یہ دیکھ کر مہمانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دسترخوان جلنے کی بجائے صاف ستھرا اور اُجلا ہو گیا ہے۔ انھوں نے حضرت انس سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ حضور نبی کریم نے اس دسترخوان سے کئی مرتبہ اپنے دست و دہان مبارک پونچھے ہیں۔ اس پر مولانا

آتش وعذاب سے ڈرنے والوں کو ایسی ہی برگزیدہ ہستی کے دست ولب کا قرب ڈھونڈھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو ذاتِ مبارک جمادات کو ایسی عزت سے نوازتی ہے وہ اپنے عشاق پر کیا کیا نوازشات نہ فرمائے گی۔ جس ہستی نے خاکِ کعبہ کو قبلہ بنا دیا، اس کی خاکِ پا چننے ہی میں ہر طرح کی نجات ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کے اشعار نہایت عمدہ ہیں[۱۵]

اس حصے کے بعد سرورِ کائنات ؐ کے دو ایک معجزوں کا ذکر کرتے ہوئے حضور کو کئی جگہ مختلف القاب ـــ مغیثِ دو عالم، سرور، نورِ جاں، شفیع مجرماں، عزیز، مہتر، بہتر، ماہرو، قند خو، خیر البشر، خیر الوریٰ، مصطفیٰ اور بحر خو ـــ سے یاد کیا گیا ہے۔ جس انداز میں یہ القاب استعمال کیے گئے ہیں وہ مولانا کے فخرِ انبیا کے ساتھ انتہائی عشق اور والہانہ عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ اس حصے میں ایسے لوگوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے جو اپنی جہالت و نادانی کی بنا پر "مسبّب" کی بجائے صرف "سبب" پر نظر رکھتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

---

[۱۵] ملاحظہ ہو: کتاب مثنوی، ص ۲۸۰ ـــ مثنوی، ص ۳/ ۷۸

برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالم گیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علمِ فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں کتبِ فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریقِ حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے، پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، ان کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں، اور جن کو مسائلِ فقہ کے اصل مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع کے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات ۳۰۸ ـ قیمت ـ/۱۵ روپے ـ ملنے کا پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور